© rasailojaraid.com

تفہیم القرآن

الدُّخان

(۲)

اچھا، انتظار کرو اُس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔ (اب کہتے ہیں کہ) "پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں"۔ اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ اِن کے پاس رسولِ مُبین آگیا[۱۱] پھر بھی یہ اُس کی طرف مُلتفت نہ ہوئے اور کہا کہ "یہ تو سکھایا پڑھایا باولا ہے"[۱۲]۔ ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے

۱۱ رسولِ مُبین کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا رسول ہونا اُس کی سیرت، اُس کے اخلاق و کردار اور اُس کے کارناموں سے بالکل عیاں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

۱۲ اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اِسے بھروں پر چڑھا لیا، وہ درپردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اِسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آکر عام لوگوں کے سامنے اُنہیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا ہے۔ اِس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور سنجیدہ تعلیمات کو اڑا دیتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برسوں سے اُن کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ اُن معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں۔ نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پائے کا آدمی ہے۔ اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا لکھا ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر رہے تھے۔ جس روز بڑی ضرب لگے گی وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔[۱۳]

کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص درپردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ رہتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب، اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضورؐ کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، حالانکہ درپردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۷۳-۵۷۴۔ جلد سوم، ص ۴۳۵-۴۳۷)

۱۳؎ ان آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے اور یہ اختلاف خود صحابہ کرام کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مشہور شاگرد مسروق کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفے کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اس نے آیت يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ پڑھی، پھر کہنے لگا، جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا بہرا کر دے گا، مگر اہل ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہو گا کہ جیسے زکام لاحق ہو گیا ہو۔ اس کی یہ بات سن کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ تفسیر سن کر گھبرا کے اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ آدمی کو علم نہ ہو تو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہی چلے گئے تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چنانچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھا گئے۔ اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اسے بھوک کی شدت میں بس دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخر کار ابوسفیانؓ نے آکر حضورؐ سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کر دے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ عذاب دُور کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعہ کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ اور بڑی ضرب سے مراد وہ ضرب ہے جو آخر کار جنگِ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ روایت امام احمد، بخاری، ترمذی، نَسائی، ابنِ جریر اور ابن ابی حاتم نے متعدد سندوں کے ساتھ مسروق سے نقل کی ہے۔ اور مسروق کے علاوہ ابراہیم نخعی، قتادہ، عاصم اور عامر کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس آیت کی یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس لیے اس امر میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضرتِ موصوف کی رائے فی الواقع یہی تھی۔ تابعین میں سے مجاہد، قتادہ، ابو العالیہ، مُقاتل، ابراہیم النَّخَعی، ضحّاک اور عطیۃ العوفی وغیرہ حضرات نے بھی اس تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری طرف حضرت علی، ابنِ عمر، ابن عباس، ابو سعید خُدری، زید بن علی اور حسن بصری جیسے اکابر کہتے ہیں کہ ان آیات میں سارا ذکر قیامت کے قریب زمانے کا کیا گیا ہے اور وہ دھواں جس کی خبر دی گئی ہے، اُسی زمانے میں زمین پر چھائے گا۔ مزید تقویت اِس تفسیر کو اُن روایات سے ملتی ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ حُذَیفہ بن اَسِید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قیامت کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں حضور برآمد ہوئے اور فرمایا قیامت قائم نہ ہو گی جب تک دس علامات یکے بعد دیگرے ظاہر نہ ہو لینگی: سُورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ دھواں۔ دآبّہ۔ یاجوج و ماجوج کا خروج۔ عیسیٰ ابن مریمؑ کا نزول۔ زمین کا دھنسنا مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں۔ اور عدَن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی لے جائے گی (مسلم)۔ اسی کی تائید ابو مالک اشعری کی وہ روایت کرتی ہے جسے ابنِ جریر اور طَبَرانی نے نقل کیا ہے، اور ابو سعید خُدری کی روایت جسے ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوئیں کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے، اور یہ بھی حضورؐ نے فرمایا ہے کہ وہ دھواں جب چھائے گا تو مومن پر اس کا اثر صرف زکام جیسا ہو گا، اور کافر کی نَس نَس میں وہ بھر جائے گا اور اس کے ہر مَنفذ سے نکلے گا۔

اِن دونوں تفسیروں کا تعارض اوپر کی آیات پر غور کرنے سے بآسانی رفع ہو سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر کا تعلق ہے، یہ امرِ واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں حضورؐ کی دعا سے سخت قحط رونما ہوا تھا جس سے کفّار کے نتھنے بہت کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اور انہوں نے اسے رفع کرانے کے لیے حضورؐ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اس واقعہ کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۴۰۔ جلد دوم، ص ۵۹۔ ۶۰۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ جلد سوم، ص ۲۹۳)۔ ان آیات میں بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ اسی صورتِ حال کی طرف ہے۔ کفّار کا یہ کہنا کہ "پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں" اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے جبکہ ان کے پاس رسولِ مبین آگیا، پھر بھی یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ پھر یہ فرمانا کہ "ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے"۔ یہ ساری باتیں اسی صورت میں راست آسکتی ہیں جبکہ واقعہ حضورؐ ہی کے زمانے کا ہو۔ قیامت کے قریب ہونے والے واقعات پر ان کا اطلاق بعید از فہم ہے۔ اس لیے اس حد تک تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اُس کا یہ حصّہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ "دھواں" بھی اُسی زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اس شکل میں ظاہر ہوا تھا کہ بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ یہ بات قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لیے ہوئے آگیا اور لوگوں پر چھا گیا وہاں تو کہا گیا ہے کہ "اچھا تو اُس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا"۔ بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ تمہیں کی گئی ہے اُس سے ہی ہوش میں آتے ہو، تو پھر قیامت کا انتظار کرو، اُس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی تب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا۔ پس جہاں تک دھوئیں کا تعلق ہے، اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانے کی چیز نہیں ہے بلکہ علاماتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ اُن کے پاس ایک نہایت شریف رسول[۱۵] آیا اور اس نے کہا[۱۵ الف] اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو[۱۶]، میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۱۷]۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے واضح

قیامت میں سے ہے، اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ مفسرین کبار میں سے جنہوں نے حضرت ابن مسعود کی تائید کی انہوں نے پوری بات کی تائید کر دی، اور جنہوں نے ان کی تردید کی انہوں نے پوری بات کی تردید کر دی، حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ اس کا کونسا حصہ صحیح ہے اور کونسا غلط۔

۱۵ اصل میں "رسولِ کریم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابلِ تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

۱۵ الف یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں حضرت موسیٰ کے جو اقوال نقل کیے جا رہے ہیں وہ ایک وقت میں ایک ہی مسلسل تقریر کے اجزا نہیں ہیں، بلکہ سالہا سال کے دوران میں مختلف مواقع پر جو باتیں انہوں نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار سے کہی تھیں ان کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۶۳ تا ۷۴۔ ۱۰۱-۳۱۰ تا ۱۰۸- جلد سوم، ص ۹۵ تا ۸۰۔ ۲۴ تا ۴۹۸۔ ۵۵۷-۵۶۰ تا ۴۴۔۶۳۴ تا ۶۳۹- جلد چہارم، المومن آیات ۲۳ تا ۴۶۔ الزخرف ۴۶ تا ۵۶ مع حواشی)

۱۶ اصل میں اَدُّوْآ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اوپر ہم نے کیا ہے اور اس کے لحاظ سے یہ اُس مطالبے کا ہم معنی ہے جو سورۂ اعراف (آیت ۱۰۵)، سورۂ طٰہٰ (۴۷) اور الشعراء (۱۷) میں گزر چکا ہے کہ "بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دو"۔ دوسرا ترجمہ، جو حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے، یہ ہے کہ "اللہ کے بندو میرا حق ادا کرو" یعنی میری بات مانو، مجھ پر ایمان لاؤ، اور میری ہدایت کی پیروی کرو، یہ خدا کی طرف سے تمہارے اوپر میرا حق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں[۱۸]۔ اور مَیں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اِس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو[۱۹]۔"

بعد کا یہ فقرہ کہ "مَیں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں" اِس دوسرے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱۷۔ یعنی بھروسے کے قابل رسول ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ملا کر کہنے والا نہیں ہوں۔ نہ اپنی کسی ذاتی خواہش یا غرض کے لیے خود ایک حکم یا قانون گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرنے والا ہوں۔ مجھ پر تم یہ اعتماد کر سکتے ہو کہ جو کچھ میرے بھیجنے والے نے کہا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچاؤں گا۔ (واضح رہے کہ یہ دو فقرے اُس وقت کے ہیں جب حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے اپنی دعوت پیش فرمائی تھی)۔

۱۸۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مقابلے میں جو سرکشی تم کر رہے ہو یہ دراصل اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ میری جن باتوں پر تم بگڑ رہے ہو وہ میری نہیں بلکہ اللہ کی باتیں ہیں اور مَیں اُسی کے رسول کی حیثیت سے انہیں بیان کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں اس میں شک ہے کہ مَیں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں یا نہیں، تو میں تمہارے سامنے اپنے مامور من اللہ ہونے کی صریح سند پیش کرتا ہوں۔ اِس سند سے مراد کوئی ایک معجزہ نہیں ہے، بلکہ معجزات کا وہ طویل سلسلہ ہے جو فرعون کے دربار میں پہلی مرتبہ پہنچنے کے بعد سے آخر زمانۂ قیامِ مصر تک حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کو سالہا سال تک دکھاتے رہے۔ جس سند کو بھی اُن لوگوں نے جھٹلایا اُس سے بڑھ کر صریح سند آپ پیش کرتے چلے گئے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرف حواشی نمبر ۴۲-۴۳)

۱۹۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حضرت موسیٰ کی پیش کردہ ساری نشانیوں کے مقابلے میں فرعون اپنی ہٹ پر اڑا ہوا تھا مگر یہ دیکھ کر کہ اِن نشانیوں سے مصر کے عوام اور خواص روز بروز متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اُس کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ اُس زمانے میں پہلے تو اُس نے بھرے دربار میں وہ تقریر کی جو سورۂ زخرف، آیات ۵۱-۵۳ میں گزر چکی ہے (ملاحظہ ہو حواشی سورۂ زخرف ۴۵ تا ۴۹)۔ پھر زمین پاؤں تلے سے نکلتی دیکھ کر آخر کار وہ اللہ کے رسول کو قتل کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخر کار اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں[۲۰]۔ (جواب دیا گیا) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو[۲۱] لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا[۲۲]۔ سمندر کو اُس کے حال پر کھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے[۲۳]"۔ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ

وقت آنجناب نے وہ بات کہی جو سورۂ مومن، آیت ۲۷ میں گزر چکی ہے کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے پناہ لی اپنے رب اور تمہارے رب کی ہر اس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا"۔ یہاں حضرت موسیٰ اپنی اُسی بات کا حوالہ دے کر فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت سے فرما رہے ہیں کہ دیکھو، میں تمہارے سارے حملوں کے مقابلے میں اللہ رب العٰلمین سے پناہ مانگ چکا ہوں۔ اب تم میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ لیکن اگر تم خود اپنی خیر چاہتے ہو تو مجھ پر حملہ آور ہونے سے باز رہو۔ میری بات نہیں ماننے تو نہ مانو۔ مجھ پر ہاتھ ہرگز نہ ڈالنا، ورنہ اس کا بہت بُرا انجام دیکھو گے۔

۲۰؎ یہ حضرت موسیٰ کی آخری رپورٹ ہے جو انہوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی۔ "یہ لوگ مجرم ہیں" یعنی اِن کا مُجرم ہونا اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کوئی گنجائش اِن کے ساتھ رعایت برتنے اور ان کو اصلاحِ حال کا مزید موقع دینے کی باقی نہیں رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حضور آخری فیصلہ صادر فرمائیں۔

۲۱؎ یعنی اُن سب لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے، اور مصر کے وہ قبطی باشندے بھی جو حضرت یوسفؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰ کی آمد تک مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے، اور وہ لوگ بھی جنہوں نے حضرت موسیٰ کی نشانیاں دیکھ کر اور آپ کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اہلِ مصر میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۲۰)

۲۲؎ یہ ابتدائی حکم ہے جو حضرت موسیٰ کو ہجرت کے لیے دیا گیا تھا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۱۰۸۔ ۴۹۳ تا ۴۹۸)

۲۳؎ یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب حضرت موسیٰ اپنے قافلے کو لے کر سمندر پار اُتر چکے تھے اور چاہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا اُن کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو اِن چیزوں کا وارث بنا دیا۔[۲۴] پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین،[۲۵] اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔[ع] اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب، فرعون[۲۶] سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع ع

تھے کہ سمندر پر عصا مار کر اُسے پھر ویسا ہی کر دیں جیسا وہ پھٹنے سے پہلے تھا، تاکہ فرعون اور اُس کا لشکر اُس راستے سے گزر کر نہ آ جائے جو معجزے سے بنا تھا۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کو اسی طرح پھٹا کا پھٹا رہنے دو، تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اِس راستے میں اُتر آئے، پھر سمندر کو چھوڑ دیا جائیگا اور یہ پوری فوج غرق کر دی جائے گی۔

۲۴؎ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جو آلِ فرعون کے بعد مصر کے وارث ہوئے، کیونکہ تاریخوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کبھی وہاں واپس گئے ہوں اور اس سرزمین کے وارث ہوئے ہوں۔ یہی اختلاف بعد کے مفسرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۴۹۶-۴۹۷)

۲۵؎ یعنی جب وہ حکمراں تھے تو اُن کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اُن کی حمد و ثنا کے ترانوں سے دنیا گونج رہی تھی۔ خوشامدیوں کے جمگھٹے اُن کے آگے اور پیچھے لگے رہتے تھے۔ ان کی وہ ہوا باندھی جاتی تھی کہ گویا ایک عالم اُن کے کمالات کا گرویدہ اور ان کے احسانات کا زیر بار ہے اور ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مقبول نہیں۔ مگر جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان کے لیے رونے والی نہ تھی، بلکہ دنیا نے ایسا اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے خلقِ خدا کے ساتھ کوئی بھلائی کی نہ تھی کہ زمین والے ان کے لیے روتے، نہ خدا کی خوشنودی کا کوئی کام کیا تھا کہ آسمان والوں کو ان کی ہلاکت پر افسوس ہوتا۔ جب تک مشیتِ الٰہی سے ان کی رسی دراز ہوتی رہی، وہ زمین کے سینے پر مونگ دلتے رہے۔ جب ان کے جرائم حد سے گزر گئے تو اس طرح اٹھا کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا؛[۲۷] اور اُن کی حالت جانتے ہوئے اُن کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی،[۲۸] اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی۔[۲۹]

یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اُس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔[۳۰] اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔" یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی

پھینک دیئے گئے جیسے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۲۶ یعنی فرعون بجائے خود اُن کے لیے ذلّت کا عذاب تھا اور دوسرے تمام عذاب اسی ایک عذابِ مجسّم کے شاخسانے تھے۔

۲۷ اس میں ایک لطیف طنز ہے کفارِ قریش کے سرداروں پر۔ مطلب یہ ہے کہ حدِ بندگی سے تجاوز کر جانے والوں میں تمہارا مرتبہ اور مقام ہی کیا ہے۔ بڑے اونچے درجے کا سرکش تو وہ تھا جو اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر خدائی کا روپ دھارے بیٹھا تھا۔ اسے جب خس و خاشاک کی طرح بہا دیا گیا تو تمہاری کیا ہستی ہے کہ قہرِ الٰہی کے آگے ٹھیر سکو۔

۲۸ یعنی اُن کی خوبیاں اور کمزوریاں، دونوں اللہ پر عیاں تھیں۔ اُس نے بے دیکھے بھالے اُن کا انتخاب اندھا دھند نہیں کر لیا تھا۔ اُس وقت دنیا میں جتنی قومیں موجود تھیں اُن میں سے بنی اسرائیل کو جب اُس نے اپنے پیغام کا حامل اور اپنی توحید کی دعوت کا علمبردار بنانے کے لیے چنا تو اس بنا پر چنا کہ اُس کے علم میں وقت کی موجود قوموں میں سے وہی اِس کے لیے موزوں تر تھے۔

۲۹ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، ص ۷۵ تا ۸۶۔ ۱۵۴ تا ۲۲۴۔ ۵۸۰ تا ۴۶۱۔ جلد دوم، ص ۴۷ تا ۹۵۔ جلد سوم ۱۱۱ تا ۱۲۱۔

۳۰ یعنی پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ پیدا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم[۳۲] اور اس سے پہلے کے لوگ ؟ ہم نے اُن کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے[۳۳] ۔ یہ
آسمان و زمین اور اِن کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں ۔اِن کو

۳۱؎ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اٹھتے نہیں دیکھا ہے ، اس لیے ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی ۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اٹھا لاؤ تاکہ ہمیں زندگی بعد موت کا یقین آ جائے ۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بے بنیاد ہے ۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی ۔ حالانکہ سراسر مہمل تھی ۔ آخر ان سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے ؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں ؟

۳۲؎ تُبَّع قبیلۂ حِمیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا ، جیسے کسریٰ ، قیصر ، فرعون وغیرہ القاب مختلف ممالک کے بادشاہوں کے لیے مخصوص رہے ہیں ۔ یہ لوگ قومِ سبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے ۔ سنہ ۱۱۵ قبل مسیح میں اِن کو سبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور سنہ ۳۰۰ء تک یہ حکمراں رہے ۔ عرب میں صدیوں تک اِن کی عظمت کے افسانے زبان زدِ خلائق رہے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، سورۂ سبا ، حاشیہ ۳۷) ۔

۳۳؎ یہ کفار کے اعتراض کا پہلا جواب ہے ۔ اِس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص ، گروہ یا قوم کو مُجرم بنائے بغیر نہیں رہتی ۔ اخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اِس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی ہے ۔ رہا یہ سوال کہ " یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ " اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو اُس خوشحالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبَّع کی قوم ، اور اُس سے پہلے سبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے ۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دنیوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۳۴] ان سب کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے،[۳۵] وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب[۳۶] کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی سوائے اس کے کہ اللہ ہی

کے بل بوتے پر اُن سے بچ جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حواشی ۲۵-۳۶)۔

۳۴ یہ اُن کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل اس کارخانۂ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے، اسی بنا پر اُس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یونہی مٹی میں رل مل جائے گا اور اس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا، حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالق حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ فعلِ عبث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، اور ہم اس کی مفصل تشریح کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۵۵۱۔ جلد دوم، ص ۲۶۴-۲۶۵۔ جلد سوم، ص ۱۵۱-۱۵۲-۳۰۲-۳۰۳-۳۱۷ تا ۳۵۷)۔

۳۵ یہ اُن کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ "اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو"۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اٹھا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس کے لیے تو رب العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اولین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہر حال اپنے وقتِ مقرر پر ہی ہو گا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے، مرنے کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ع۱ کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے[۳۷]۔

زقوم[۳۸] کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا، تیل کی تلچھٹ[۳۹] جیسا، پیٹ میں اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔" پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔"

پھر کوئی عدالت نہیں ہوتی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلتا ہو۔

۳۶۔ اصل میں لفظ "مولیٰ" استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے، قطع نظر اس سے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو یا دوستی کا یا کسی اور قسم کا۔

۳۷۔ اِن فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اُس کا کیا رنگ ہوگا۔ کسی کی مدد یا حمایت، وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی، نہ اُس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کُلّی اختیارات اُس حاکم حقیقی کے ہاتھ میں ہونگے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اُس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اُس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس کے مقدمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہ بہر حال بے کم و کاست نافذ ہو گا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اُس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہونگے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے، ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔

۳۸۔ زقوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صافات، حاشیہ ۳۴۔

۳۹۔ اصل میں لفظ "المُہل" استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں: پگھلی ہوئی دھات، پیپ لہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا ترس لوگ امن کی جگہ میں ہونگے۳۹ - باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا۴۰ کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہونگے - یہ ہوگی ان کی شان - اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں۴۱ ان سے بیاہ دیں گے - وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے۴۲ - وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے، بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی - اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم

پگھلا ہوا تانبا، کول لاوا، تیل کی تلچھٹ - یہ مختلف معنی اہل لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں - لیکن اگر زقوم سے مراد وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں تھوہر کہتے ہیں، تو اس کو چبانے سے جو رس نکلے گا، اغلب یہی ہے کہ وہ تیل کی تلچھٹ سے مشابہ ہوگا -

۳۹ امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو۔ کوئی غم، کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مشقت اور تکلیف لاحق نہ ہو -

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہوگے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہوگے، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہوگے" (مسلم بروایت ابو ہریرہ و ابو سعید خدری)

۴۰ اصل میں سُندُس اور اِستَبرَق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں - سُندس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں - اور اِستَبرَق فارسی لفظ ستبر کا معرب ہے، اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے -

۴۱ اصل الفاظ ہیں حُورٌ عِین - حُور جمع ہے حَوراء کی اور حَوراء عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں - اور عِین جمع ہے عَیناء کی، اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لیے بولا جاتا ہے

۴۲ "اطمینان سے" طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جنتی چاہیں گے بے فکری کے ساتھ جنت کے خادموں کو اس کے لانے کا حکم دیں گے اور وہ حاضر کردی جائے گی - دنیا میں کوئی شخص ہوٹل تو در کنار، خود اپنے گھر میں اپنی چیز بھی اُس اطمینان سے طلب نہیں کر سکتا جس طرح وہ جنت میں طلب کرے گا - کیونکہ یہاں کسی چیز کے بھی اتھاہ ذخیرے کسی کے پاس نہیں ہوتے، اور جو چیز بھی آدمی استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عذاب سے بچا دے گا، یہی بڑی کامیابی ہے۔[۴۴]

اے نبی، ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اب تم بھی انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔[۴۵] ع س ع

کرتا ہے اس کی قیمت بہر حال اس کی اپنی جیب ہی سے جاتی ہے۔ جنت میں مال اللہ کا ہوگا اور بندے کو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہوگی۔ نہ کسی چیز کے ذخیرے ختم ہو جانے کا خطرہ ہوگا نہ بعد میں بِل پیش ہونے کا کوئی سوال۔

[۴۴] اس آیت میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جہنم سے بچائے جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے، حالانکہ کسی شخص کا جنت میں پہنچ جانا آپ سے آپ اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ جہنم میں جانے سے بچ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرمانبرداری کے انعام کی قدر انسان کو پوری طرح اسی وقت محسوس ہو سکتی ہے جبکہ اس کے سامنے یہ بات بھی ہو کہ نافرمانی کرنے والے کہاں پہنچے ہیں، اور وہ کس بُرے انجام سے بچ گیا ہے۔ دوسری قابلِ توجہ بات اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جہنم سے بچنے اور جنت میں پہنچنے کو اپنے فضل کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ اس سے انسان کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کامیابی کسی شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو۔ اگرچہ آدمی کو انعام اس کے عمل ہی پر ملے گا، لیکن اول تو حسنِ عمل ہی کی توفیق آدمی کو اللہ کے فضل کے بغیر کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ پھر جو بہتر سے بہتر عمل بھی آدمی سے بن آسکتا ہے وہ کبھی کامل و اکمل نہیں ہو سکتا جس کے متعلق دعوے سے یہ کہا جا سکے کہ اس میں نقص کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ بندے کی کمزوریوں اور اس کے عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اس کی خدمات کو قبول فرما لے اور اسے انعام سے سرفراز فرمائے۔ ورنہ باریک بینی کے ساتھ حساب کرنے پر وہ اتر آئے تو کس کی یہ ہمت ہے کہ اپنی قوتِ بازو سے جنت جیت لینے کا دعویٰ کر سکے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا اعملوا وسدّدوا وقاربوا واعلموا انّ احداً لن یدخلہ عملہ الجنّۃ "عمل کرو اور اپنی حدِ استطاعت تک زیادہ سے زیادہ ٹھیک کام کرنے کی کوشش کرو، مگر یہ جان لو کہ کسی شخص کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محض اس کا عمل ہی جنت میں نہ داخل کر دے گا۔" لوگوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ، کیا آپ کا عمل بھی؟" فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ "ہاں میں بھی محض اپنے عمل کے زور سے جنت میں نہ پہنچ جاؤں گا الّا یہ کہ میرا رب مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔"

۲۵ یعنی اب اگر یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے تو دیکھتے رہو کہ ان کی کس طرح شامت آتی ہے۔ اور یہ لوگ بھی اس انتظار میں ہیں کہ دیکھیں تمہاری اس دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن جلد اوّل میں ایک تصحیح

تفہیم القرآن جلد اوّل جن حضرات کے پاس موجود ہے ان سے گزارش ہے کہ سورۂ نساء حاشیہ نمبر ۱۹۵ کی آخری سطریں "پس قرآن کی روح سے جو طرزِ عمل زیادہ مطابقت رکھتا ہے" سے آخر تک حذف کر کے ان کی جگہ حسبِ ذیل سطور درج کریں:

"پھر رفعِ جسمانی کے اِس عقیدے کو مزید تقویت اُن احادیث سے پہنچتی ہے جو قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ ابن مریم کے دوبارہ دنیا میں آنے اور دجال سے جنگ کرنے کی تصریح کرتی ہیں (تفسیر سورۂ احزاب کے ضمیمہ میں ہم نے ان احادیث کو نقل کر دیا ہے)۔ اُن سے حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی تو قطعی طور پر ثابت ہے۔ اب یہ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ اُن کا مرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، یا زندہ کہیں خدا کی کائنات میں موجود ہونا اور پھر واپس آنا؟"

ایک اور تصحیح

ترجمان القرآن، جون ۱۹۶۵ء میں صفحہ ۲۴۰ پر ایک آیت غلط درج ہو گئی ہے۔ اِنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ کے بجائے صحیح الفاظ اِنَّ ھٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ہیں۔

© rasailojaraid.com